* مرکّب جملے:

استدراکی جملے:

اس میں عموماً دو جملوں کا باہم مقابلہ کیا جاتا ہے۔اس طرح کے جملوں میں مگر، لیکن،اور، پر، بلکہ، سو وغیرہ استعمال ہوتے ہیں۔اس کی تین قسمیں ہیں۔

(۱) دوسرا جملہ پہلے جملے کے خلاف یا اس کی نفی کرے مثلاً:

وہ ترقی کرتے ہوئے کہاں جا پہنچا مگر میں وہیں کا وہیں ہوں۔

اتنا بڑا عالم اور اس قدر سنگ دِل

- بعض اوقات اس طرح کے جملے ''اگرچہ'' سے شروع ہوتے ہیں ۔جیسے:

اگرچہ اُس نے مجھے نظر انداز کیا تھا لیکن میں اُس کی مدد کروں گا۔

(۲) دوسرا جملہ پہلے جملے کو محدود یا مقید کرے۔جیسے:

وہ وعدے تو کرتا ہے لیکن یاد نہیں رکھتا۔

وہ دوست تو ہے پر مصیبت کا ساتھی نہیں۔

(۳) دوسرا بیان پہلے بیان کی توسیع یا تصدیق کرے۔جیسے:

اُس نے صرف خود غرضی ہی نہیں کی بلکہ طرح طرح کی تکالیف بھی پہنچائیں ۔

سببی جملے:

اِن جملوں میں دوسرا جملہ پہلے جملے کی وجہ سبب یا نتیجے کو ظاہر کرے۔ان جملوں سے پہلے کیوں کہ، اس لیے، اس واسطے، لہٰذا، پس وغیرہ کا استعمال ہوتا ہے۔

(i) وہ بہت بدتمیز ہے اس لیے میں اُس سے زیادہ بات چیت نہیں کرتا۔

(ii) مجھے اُس کی بات کا یقین ہے کیوں کہ وہ سچا ہے۔

(iii) بعض اوقات اس طرح کے جملوں سے پہلے لفظ ''چونکہ'' کا استعمال بھی ہوتا ہے۔مثلاً:

(iv) چونکہ وہ حق پر ہے اس لیے میں اُس کا ساتھ ضرور دوں گا۔

فرحت اللہ بیگ

ولادت: ۱۸۸۳ء

وفات: ۱۹۴۷ء

فرحت اللہ بیگ دِلّی کے محلّہ چوڑی والاں میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام مرزا حشمت اللہ بیگ تھا۔ فرحت ابھی کم سِن ہی تھے کہ اُن کی والدہ کا انتقال ہوگیا۔اُن کی پرورش اُن کی پھوپھی حُسن جہاں بیگم نے کی۔فرحت کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔اُنھوں نے سینٹ سٹیفنز کالج سے بی۔اے کیا۔شعر و شاعری کا شوق طالب علمی کے زمانے میں پیدا ہوا۔

فرحت اللہ بیگ کو ملازمت کے سلسلے میں حیدر آباد جانا پڑا۔ اور وہیں کے ہو کر رہ گئے۔فرحت اللہ بیگ نے اپنی ۶۴ سالہ زندگی میں ۴۰ سال حیدر آباد میں گزارے۔یہ وہ دور تھا جب انگریزی تسلط کے بعد دلی شہر تہذیبی لحاظ سے عبوری دور سے گزر رہا تھا۔فرحت جب بھی دلّی آتے اُس میں اُنھیں نت نئی تبدیلیاں نظر آتیں۔فرحت پُرانی تہذیب کے دلدادہ تھے۔اُنھیں یہ تبدیلیاں گراں گزرتیں یہی وجہ ہے کہ فرحت نے اپنی تحریروں میں پُرانی تہذیب کو محفوظ کرنے کی کوشش کی ہے۔

مزاح نگار کی حیثیت سے فرحت اللہ بیگ کا ایک خاص مقام ہے۔اُن کی تحریریں خوش طبعی اور ظرافت کا نمونہ ہیں۔اس کے علاوہ اُن کے تحریر کردہ خاکے بڑے ذوق و شوق سے پڑھے جاتے ہیں۔ یہ خاکے اُردو ادب میں بلند مقام رکھتے ہیں۔اِن خاکوں میں ممدوح کی بے پناہ سچی جھوٹی تعریفوں کی بجائے حقیقی واقعات اور ممدوح کی خوبیوں، خامیوں اور کمزوریوں کے بارے میں غیر جانبداری سے تبصرہ کیا گیا ہے۔

فرحت اللہ بیگ کا اسلوب گنجلک اور بوجھل نہیں ۔ اُن کی تحریروں میں دلکشی اور چاشنی پائی جاتی ہے۔دلّی کی ٹیکسالی زبان پر اُنھیں عبور تھا۔اُنھیں زبان و بیان پر مکمل قدرت حاصل تھی۔ وہ گنجلک، مشکل، ادق اور نامانوس الفاظ کے استعمال کو نامناسب سمجھتے ہیں۔زبان سیکھنے کے لیے ایسے حضرات کی کتابیں پڑھنا مفید ہے۔

تصانیف: مضامینِ فرحت، دلّی کا یادگار مشاعرہ، نذیر احمد کی کہانی: کچھ اُن کی کچھ میری زبانی وغیرہ۔

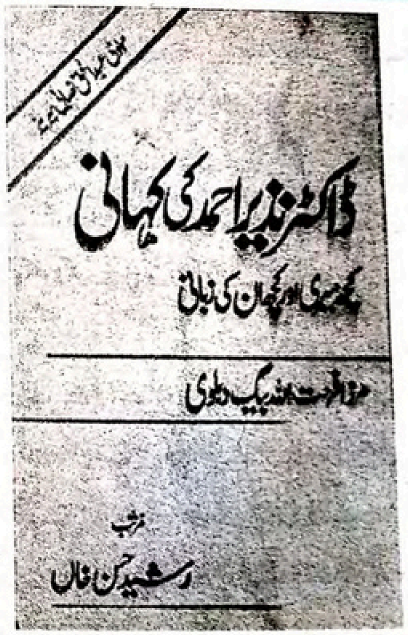

ایک وصیّت کی تعمیل

خدا بخشے، مولوی وحید الدین سلیم بھی ایک عجیب چیز تھے۔ ایک نگینہ سمجھیے کہ برسوں ناتراشیدہ رہا۔ جب تراشا گیا، چمک بڑھی، اہل نظر میں قدر ہوئی، اس وقت چٹ سے ٹوٹ گیا۔

شہرت بھی، غالب کے قصیدے کی طرح آج کل کسی کو راس نہیں آتی۔ اِدھر نام بڑھا اور اُدھر مرا۔ صَف سے آگے نکلا اور تیرِ قضا کا نشانہ ہوا۔ چَل چلاؤ کا زور ہے۔ آج یہ گیا، کل وہ گیا۔ مولوی نذیر احمد گئے، شبلی گئے، حالی گئے، وحید الدین گئے۔ آج کل کا مرنا بھی کچھ عجیب مرنا ہوگیا ہے۔ پہلے زندگی کو چراغ سے تشبیہ دیتے تھے، بتی جلتی، تیل خرچ ہوتا، تیل ختم ہونے کے بعد چراغ جھلملاتا، ٹمٹماتا، لو بیٹھنی شروع ہوتی اور آخر رفتہ رفتہ ٹھنڈا ہوجاتا۔ اب چراغ کی جگہ زندگی، بجلی کا لیمپ ہوگئی ہے۔ اِدھر بٹن دبایا، اُدھر اندھیرا گھپ، عظمت اللہ خاں اسی طرح مرے، مولوی وحید الدین اِسی طرح رخصت ہوئے۔ اَب دیکھیں کس کی باری ہے؟ اردو کی مجلس میں دو چار لیمپ جل رہے ہیں، وہ بھی کسی وقت کھٹ سے گُل ہوجائیں گے، اس کے بعد بس اللہ ہی اللہ ہے۔

میں مدت سے حیدر آباد میں ہوں۔ مولوی وحید الدین بھی برسوں سے یہاں تھے، لیکن کبھی ملنا نہیں ہوا۔ انھیں ملنے سے فرصت نہ تھی۔ مجھے ملنے کی فرصت نہ تھی۔ آخر ملے تو کب ملے کہ مولوی صاحب مرنے کو تیار بیٹھے تھے۔ گذشتہ سال کالج کے جلسے میں مولوی عبدالحق صاحب نے مجھے اورنگ آباد کھینچ بلایا۔ روانہ ہونے کے لیے جو حیدر آباد کے اسٹیشن پر پہنچا؟ تو کیا دیکھتا ہوں کہ اسٹیشن اورنگ آباد جانے والوں سے بھرا پڑا ہے۔ طالب علم بھی ہیں، ماسٹر بھی ہیں، کچھ ضرورت سے جا رہے ہیں، کچھ بے ضرورت چلے جا رہے ہیں، کچھ واقعی مہمان ہیں، کچھ بن بلائے مہمان ہیں، غرض یہ کہ آدھی ریل اٹھی اورنگ آباد کے مسافروں نے

گھیر رکھی ہے۔

ریل کی روانگی میں دیر تھی۔ سب کے سب پلیٹ فارم پر کھڑے گپیں مار رہے تھے۔ میں بھی ایک صاحب سے کھڑا باتیں کر رہا تھا کہ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بڑے میاں بھیڑ کو چیرتے پھاڑتے، بڑے بڑے ڈگ بھرتے، میری طرف چلے آرہے ہیں۔ متوسط قد، بھاری گٹھیلا بدن، بڑی سی توند، کالی سیاہ فام رنگت، اس پر سفید چھوٹی سی گول ڈاڑھی، چھوٹی چھوٹی کرنجی آنکھیں، شرعی سفید پائجامہ، کتھی رنگ کی کشمیری شیروانی، سر پر عنابی ترکی ٹوپی، پاؤں میں جرابیں اور انگریزی جوتا۔ آئے اور آتے ہی مجھے گلے لگالیا۔ حیران تھا کہ یاالٰہی یہ کیاماجرا ہے؟ کیا امیر حبیب اللہ خاں اور مولوی نذیر احمد مرحوم کی ملاقات کا دوسرا سین ہونے والا ہے؟ جب ان کی اور میری ہڈیاں پسلیاں گلے ملتے ملتے تھک کر چور ہوگئیں، اس وقت انھوں نے فرمایا: ”مجھے تم سے ملنے کا بڑا شوق تھا۔ جب سے تمھارا نذیر احمد والا مضمون دیکھا ہے، کئی دفعہ ارادہ کیا کہ گھر پر آکر ملوں، مگر موقع نہ ملا۔ قسمت میں ملنا تو آج لکھا تھا۔ بھئی! مجھے نذیر احمد کی قسمت پر رشک آتا ہے کہ تجھ جیسا شاگرد اس کو ملا، مرنے کے بعد ان کا نام زندہ کردیا۔ افسوس ہے ہم کو کوئی ایسا شاگرد نہیں ملتا جو مرنے کے بعد اُسی رنگ میں ہمارا حال بھی لکھتا“۔

میں پریشان تھا کہ یا اللہ! یہ ہیں کون اور کیا کہہ رہے ہیں؟ مگر میری زبان کب رکتی ہے، میں نے کہا: ”مولوی صاحب! گھبراتے کیوں ہیں۔ بسم اللہ کیجیے۔ مرجائیے، مضمون میں لکھ دوں گا“۔

کیا خبر تھی کہ سال بھر کے اندر ہی اندر مولوی صاحب مرجائیں گے اور مجھے ان کی وصیّت کو پورا کرنا پڑے گا۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ یہ مولوی وحید الدین ہیں تو واقعی مجھے بہت پشیمانی ہوئی، میں نے معذرت کی۔ وہ خود شگفتہ طبیعت لے کر آئے تھے، رنج تو کجا بڑی دیر تک ہنستے اور اس جملے کے مزے لیتے رہے۔ سر ہوگئے کہ جس گاڑی میں تو ہے، میں بھی اسی میں بیٹھوں گا۔ شاگردوں کی طرف دیکھا، انھوں نے ان کا سامان لا، میرے درجے میں رکھ دیا۔ ادھر ریل چلی، اور ادھر ان کی زبان چلی۔ رات کے بارہ بجے، ایک بجا، دو بج گئے، مولوی صاحب نہ خود سوتے ہیں اور نہ سونے دیتے ہیں۔ درجہ اول میں ہم تین آدمی

تھے۔ مولوی صاحب اور رفیق بیگ۔ رفیق بیگ تو سوگئے، ہم دونوں نے باتوں میں صبح کردی۔ اپنی زندگی کے حالات بیان کیے، اپنے علمی کارناموں کا ذکر چھیڑا، اصطلاحاتِ زبانِ اردو پر بحث ہوتی رہی، شعر و شاعری ہوئی، دوسروں کی خوب خوب برائیاں ہوئیں، اپنی تعریفیں ہوئیں، مولوی عبدالحق کو برا بھلا کہا کہ اس بیماری میں مجھے زبردستی کھینچ بلایا۔ غرض چند گھنٹے بڑے مزے سے گزر گئے۔ صبح ہوتے ہوتے کہیں جا کر آنکھ لگی۔ شاید ہی گھنٹا بھر سوئے ہوں گے کہ ان کے شاگردوں اور ساتھیوں نے گاڑی پر یورش کردی۔ پھر اٹھ بیٹھے اور پھر وہی علمی مباحث شروع ہوئے۔ پھبتیاں اُڑیں، اِس کو بے وقوف بنایا، اُس کی تعریف کی۔ ہنسی اور قہقہوں کا وہ زور تھا کہ درجے کی چھت اُڑی جاتی تھی۔ اورنگ آباد تک یہی غل غپاڑا رہا۔

میں نے باتوں باتوں میں یہ بھی کوشش کی کہ مولوی صاحب کی طبیعت کا اندازہ لگاؤں۔ پہلے تو ذرا بند بند رہے، لیکن آخر میں بالکل کھل گئے۔ میں نے جو رائے ان کے متعلق قائم کی ہے، وہ سن لیجیے۔ سب سے پہلے تو یہ ہے کہ ان میں ظرافت کا مادہ بہت تھا، لیکن یہ ظرافت اکثر رکاکت کی صورت اختیار کرلیتی تھی۔ کسی کو برا بھی کہتے تو ایسے الفاظ میں کہتے کہ سننے سے تکلیف ہوتی اور جب کہنے پر آتے تو پھر یہ نہ دیکھتے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں اور کس کے سامنے کہہ رہا ہوں۔ نتیجہ اکثر یہ ہوتا کہ لوگ اِدھر سے اُدھر لگا دیتے اور مولوی صاحب کی کسی نہ کسی سے بگڑ جاتی۔ شاید ہی کوئی بھلا آدمی ہوگا، جو سچے دل سے ان کو چاہتا ہو۔ ان کے علم، ان کی سمجھ، ان کی زُود فہمی، اور ان کی طبعِ رسا کی سب تعریف کرتے ہیں، لیکن ان کی طبیعت کے سب شاکی ہیں اور وہ خود بھی اس سے بیزار تھے۔

بات یہ ہے کہ انھوں نے زمانے کی وہ ٹھوکریں کھائی تھیں کہ خدا کی پناہ۔ خاصا بھلا چنگا آدمی دیوانہ ہوجائے۔ اگر مولوی صاحب کی طبیعت پر ان مصیبتوں نے اتنا اثر کیا، تو کیا تعجب ہے۔ جب کسی نااہل کو بڑی خدمت پر دیکھتے تو ان کے آگ لگ جاتی۔ ریل میں دو ایک بڑے شخصوں کا ذکر آیا انھوں نے ہر دفعہ یہی کہا: ”اے میاں! گدھا ہے، ایک سطر صحیح نہیں لکھتا اور دیکھو تو کون ہیں کہ نواب صاحب، ہم کو دیکھو، تمام عمر علم حاصل کرنے میں گزری۔ اس اخبار کی ایڈیٹری کی، اس رسالے کے منیجر ہوئے۔ سرسید کی

خدمت میں سرگاڑی پاؤں پیہا کیا۔ اب جو چند روپلی مل رہے ہیں، تو فلاں صاحب جلے جاتے ہیں، خبرنہیں کچھ ہوتے تو گلا ہی گھونٹ دیتے"۔

میں نے کہا: "مولوی صاحب! یہ دنیا ہے آخرت نہیں ہے کہ جیسا بوؤ گے ویسا پھل ملے گا۔ یہاں اہلِ کمال ہمیشہ آشفتہ حال رہے ہیں۔ آپ کیوں خواہ مخواہ اپنا دل جلاتے ہیں۔ جو اللہ نے دیا ہے، بہت ہے" آگے ناتھ نہ پیچھے پگا"۔ مزے کیجیے، بہت گئی ہے، تھوڑی رہی ہے، ہنسی خوشی یہ بھی گزار دیجیے۔

وہ بھلا میری باتوں کو کیا سننے والے تھے، ان کے تو دل میں زخم تھے۔ تمام عمر مصیبت اٹھائی تھی، نااہلوں کو آرام وآسائش میں دیکھ کر وہ زخم ہرے ہوجاتے تھے۔ زبان اپنی تھی، کسی کا دینا نہیں آتا تھا۔ بے نقط سنا کر دل ٹھنڈا کرلیتے تھے۔

زمانے کے ہاتھوں ان کی طبیعت میں ایک دوسرا انقلاب یہ بھی ہوگیا تھا کہ جتنی اُن کی نگاہ وسیع ہوئی، اتنا ہی ان کا دل تنگ ہوا۔ جتنی ان کے قلم میں روانی پیدا ہوئی، اتنی ہی ان کی مٹھی بند ہوئی۔ میں ان کے پیٹھ پیچھے نہیں کہتا۔ جب ان کے منہ پر کہہ چکا ہوں کہ مولوی صاحب، آپ کی کفایت شعاری نے بڑھتے بڑھتے کنجوسی کی شکل اختیار کرلی ہے، تو اب لکھتے کیوں ڈروں۔ واقعی بڑے ہی کنجوس تھے۔ ہزار روپے کے گریڈ میں تھے۔ دارالترجمہ سے بہت کچھ مل جاتا تھا، مگر خرچ کی پوچھو تو صفر سے کچھ ہی زیادہ ہوگا۔ اُس کی صراحت، میں آگے چل کر کروں گا، ہاں! اُن کا یہ عذر سب کو ماننا پڑے گا کہ مفلسی کے پے درپے حملوں نے ان کی آنکھیں کھول دی تھیں۔ اُن کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ اس خدمت پر کب تک ہیں اور کب نکال دیے جائیں گے۔ خشک سالی کے اندیشے سے ارزانی کے زمانے میں کھتے بھرنے کی فکر میں رہے۔ خود چل بسے اور جمع پونجی دوسروں کے لیے چھوڑ گئے اور چھوڑ بھی اتنی گئے کہ بعض لوگوں کو افسوس ہوا کہ ہم ان کے بیٹے کیوں نہ ہوئے۔

بہرحال یونہی ہنستے، بولتے دو بجے اورنگ آباد پہنچ گئے۔ بڑے زور کا استقبال ہوا۔ موٹروں میں لد کر کیا دیکھتے ہیں کہ یہاں سے وہاں تک خیمے ہی خیمے لگے ہیں۔ خیموں کے سامنے جلسے کا

منڈوا ہے۔ منڈوے کے سامنے جو خیمہ تھا، اس میں مجھے اور مولوی صاحب کو جگہ ملی۔ مولوی صاحب کی طبیعت پہلے سے بدمزا تھی۔ راستے کی تھکان اور رات بھر کے جاگنے سے اور خراب ہوگئی۔ بخار چڑھ آیا۔ دو وقت کھانا نہیں کھایا۔ تیسرے وقت بڑے کہنے سننے سے تھوڑا سا دودھ پیا۔

دوسرے روز ان کا لیکچر تھا۔ طبیعت صاف نہیں تھی، پھر بھی بڑے میاں کو جوش آگیا۔ ٹرنک میں سے جوڑا نکالا۔ ریشمی شیروانی نکالی، نئی ترکی ٹوپی نکالی، اپنا میلا کچیلا جوڑا پھینک، نیا پہن اس ٹھاٹھ سے جلسے میں آئے کہ واہ واہ واہ۔ کھڑے ہوکر لیکچر دینے کا دَم نہ تھا، کرسی بچھا دی گئی۔ انھوں نے جیب میں سے چھوٹے چھوٹے نیلے کاغذ کے پرچوں کی ایک گڈی نکالی اور لیکچر پڑھنا شروع کیا۔

میں ہمیشہ سے یہ سمجھتا تھا کہ اسپیچ کے پڑھنے میں الفاظ کا زور کم ہوجاتا ہے، مگر مولوی صاحب کے طرزِ ادا نے میرا خیال بالکل بدل دیا۔ اُن کے پڑھنے میں بھی وہی بلکہ اس سے زیادہ زور تھا۔ جتنا بولنے میں ہوتا ہے، معلوم ہوتا تھا کہ شیر گرج رہا ہے۔ دو ہزار آدمی کا مجمع تھا، مگر سناٹے کا یہ عالم تھا کہ سوئی گرے تو آواز سن لو۔ لفظوں کی نشست، زبان کی روانی، آواز کے اُتار چڑھاؤ سے معلوم ہوتا تھا کہ ایک دریا ہے کہ اُمڈا چلا آرہا ہے۔ ایک برقی رو ہے کہ کانوں سے گزر کر دل و دماغ پر اثر کررہی ہے، مگر اب تک وہ آواز میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔ میں نے بڑے بڑے لیکچر دینے والوں کو سنا ہے مگر میں یقین دلاتا ہوں کہ پڑھ کر ایسا اثر پیدا کرنے والا، میری نظر سے کوئی نہیں گزرا۔ کچھ تو بات تھی کہ آخر زمانے میں سرسید مرحوم اپنے اکثر لیکچر انھیں سے پڑھوایا کرتے تھے۔ اس میں ان کا مدِ مقابل نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔

اُسی روز ایک واقعہ پیش آیا کہ اس کا خیال کرکے اب تک مجھے ہنسی آتی ہے۔ "۱۲۶۱ھ میں دہلی کا ایک مشاعرہ" اسی جلسے میں زندہ کیا گیا تھا۔ وہی سازوسامان، وہی کپڑے اور وہی لوگ، سو برس کے بعد پھر سامنے لائے گئے تھے۔ اسٹیج کے انتظام ہی کے لیے مولوی عبدالحق صاحب نے مجھے پکڑ بلایا تھا۔ پہلے بہروپ اور نقلیں ہوتی رہیں، آخر پردہ گرا اور مشاعرے کا نمبر آیا۔ تھوڑی دیر میں سٹیج کا رنگ بدلنا کچھ آسان کام نہ تھا۔ دریاں، چاندنیاں، قالین بچھانا، گاؤ تکیے لگانا، سامان جمانا، مشعلیں جلانا، غرض اتنا کام تھا کہ

پردہ گرے گرے بڑی دیر ہوگئی اور لوگوں میں ذرا ہل چل ہونے لگی۔ مجھے اس وقت سوا اس کے اور کچھ نہ سوجھا کہ ایک چھوٹی سی تقریر کرکے اس بے چینی کو کم کروں۔ میں نے کہا'' یارو! ذرا جلدی کرو، دیر ہو رہی ہے، مزا کر کرا ہوجائے گا۔ میں باہر جا کر کچھ بولنا شروع کرتا ہوں۔ تمھارا کام جب ختم ہوجائے، تو سیٹی بجادینا، میں اپنی اسپیچ ختم کردوں گا''۔ اتنا کہہ کر میں چٹ باہر پردے کے سامنے آگیا۔ مضمون سوچنے کا موقع نہیں ملتا تھا، اس وقت یہی سمجھ میں آیا کہ اپنے مضمون کی تمہید کو ذرا مذاق میں ادا کروں۔

جن صاحبوں نے وہ مضمون پڑھا ہے، وہ واقف ہیں کہ میں نے اس مضمون کو مولوی کریم الدین صاحب ''طبقات الشعرائے ہند'' سے منسوب کرکے یہ ظاہر کیا ہے کہ یہ مشاعرہ انھی کے مکان پر نواب زین العابدین خان کی مدد سے ہوا۔ چنانچہ میں نے اپنے لیکچر میں ابتداً اس زمانے کی دہلی کا نقشہ کھینچا اور پھر مولوی کریم الدین صاحب کا پانی پت سے دہلی آنا مزاحیہ پیرائے میں بیان کیا۔ ان کی پھٹی ہوئی جوتیوں، ان کے خاک آلودہ کپڑوں، ان کی وحشت زدہ شکل اور ان کی مفلسی کا نقشہ خدا جانے کن الفاظ میں کھینچ گیا۔ پھر ان کے دہلی میں آکر تعلیم پانے، مسجد کی روٹیوں پر پڑے رہنے، دوسروں کی مدد سے مطبع کھولنے کا ذکر کرکے یہ بتایا کہ آخر کس طرح اس مشاعرے کی اجازت ہوئی اور کس طرح دہلی کے تمام شعراء اس میں جمع ہوئے۔

میں اسپیچ دینے میں سیدھا کھڑا نہیں رہتا، کچھ ہاتھ پاؤں بھی ہلاتا ہوں۔ خدا معلوم مولوی کریم الدین کا حال بیان کرنے میں کیوں میرے ہاتھ کا اشارہ کئی دفعہ مولوی وحید الدین سلیم کی طرف ہوگیا۔ مجھے تو معلوم نہیں، مگر جلسے میں اس نے کچھ اور ہی معنی پیدا کرلیے۔ مولوی وحید الدین کے والد بھی پانی پت سے دہلی آئے تھے۔ کتابوں کا بیوپار کرتے تھے۔ لوگ سمجھے کہ مولوی کریم الدین ہی مولوی وحید الدین کے والد تھے۔ ناموں کے یکساں ہونے نے اس خیال کو اور تقویت دی، اب جو ہے وہ مولوی صاحب سے پوچھتا ہے۔'' مولوی صاحب! کیا مولوی کریم الدین صاحب آپ کے والد تھے؟''

مولوی صاحب کے تاؤ کی کچھ نہ پوچھو، دل ہی دل میں اونٹے رہے۔ خدا خدا کرکے ڈیڑھ بجے مشاعرہ ختم ہوا۔ اسٹیج کے دروازے سے جو نکلتا ہوں، تو کیا دیکھتا ہوں کہ مولوی صاحب دیوار سے چپکے

کھڑے ہیں مجھے دیکھتے ہی بپھر گئے۔ کہنے لگے '' فرحت! یہ سب تیری شرارت ہے۔ کریم الدین کو میرا باپ بنادیا۔'' میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر یہ کہہ کیا رہے ہیں؟ بڑی مشکل سے مولوی صاحب کو ٹھنڈا کیا۔ وہاں سے لے جا کر خیمے میں بٹھایا، پان بنا کر دیا، سگریٹ پیش کیا، جب جا کر ذرا نرم پڑے اور واقعہ بیان کیا۔

میں نے کہا: '' مولوی صاحب! بھلا مجھ سے ایسی گستاخی ہوسکتی تھی۔ اول تو اس مذاق کا یہ موقع ہی کیا تھا، دوسرے مجھے کیا معلوم کہ آپ کے والد کون تھے، کہاں کے تھے، دہلی آئے بھی تھے یا نہیں، کتابیں بیچتے تھے یا کیا کرتے تھے؟''

کہنے لگے: '' تو گھڑی گھڑی، ہاتھ سے میری طرف کیوں اشارہ کرتا تھا''۔ میں نے کہا: '' مولوی صاحب! اسپیچ دینے میں ہاتھ کا اشارہ خود بہ خود اسی طرح ہوجاتا ہے۔ اب اگر اگلی صف میں بیٹھ کر آپ اس اشارے کو اپنے سے متعلق کرلیں تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟''

بہرحال یہ بات لوگوں کے دلوں میں کچھ ایسی جم گئی کہ مٹائے نہ مٹی۔ جب تک اورنگ آباد میں رہے، ہر شخص مولوی صاحب سے یہی سوال کرتا تھا: '' مولوی صاحب! کیا مولوی کریم الدین صاحب آپ کے والد تھے؟ یہ کبھی تو ہنس کر چپ ہوجاتے، کبھی صرف جھڑک دیتے، کبھی جَل کر کہتے: '' جی ہاں، میرے والد تھے، کچھ آپ کا دینا آتا ہے''۔

اورنگ آباد سے واپس آنے کے بعد میرا ان کے ہاں آنا جانا بہت ہوگیا تھا۔ جب کچھ لکھتا، پہلے ان کو جا کر سناتا۔ بڑے خوش ہوتے، تعریفیں کرتے، دل بڑھاتے، ہائے ان کے گھر کا نقشہ اس وقت آنکھوں میں پھر گیا۔ گھر بہت بڑا تھا، مگر خالی ڈھنڈار، ساٹھ روپے مہینا کرایہ دیتے اور اپنی اکیلی جان سے رہتے۔ نہ بال نہ بچہ، نہ نوکر، نہ ماما، میں گیا، باہر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ آواز آئی: '' کون؟''

میں نے کہا: '' فرحت۔'' اُسی وقت کرتا پہنتے ہوئے آئے، دروازہ کھولا، اندر لے گئے۔ برآمدے میں ایک بان کی چارپائی پڑی ہے، دو تین تختے جڑی ٹوٹی پھوٹی کرسیاں ہیں۔ اندر ایک ذرا سی دری بچھی

ہے، اس پر میلی چاندنی ہے۔ دو چار چوہا چکٹ تکیے اور ایک سڑی ہوئی رضائی رکھی ہے۔ دیواروں پر ایک دو سگریٹ کے اشتہاروں کی تصویریں اور تین چار پرانے کیلنڈر لٹکے ہیں۔ سامنے دیوار کی الماری میں پانچ چھے کنڈا ٹوٹی چائے کی پیالیاں، کنارے جھڑی رکابیاں، ایک دو چائے کے ڈبے رکھے ہیں۔ سامنے کے کمرے میں کھونٹیوں پر دو تین شیروانیاں، دو تین ٹوپیاں لٹک رہی ہیں۔ نیچے دو تین پرانے کھڑنک جوتوں کے جوڑے پڑے ہیں۔ لیجیے، مولوی صاحب کے گھربار کا یہ خلاصہ ہے۔ مولوی صاحب بیٹھے ہیں۔ سامنے دو انگیٹھیاں رکھی ہیں۔ ایک پر پانی، دوسری پر دودھ جوش ہورہا ہے۔ چائے بن رہی ہے، خود پی رہے ہیں، دوسروں کو پلا رہے ہیں، ایک نمک کا ڈلا پاس رکھا ہے، چائے بنائی، نمک کے ڈلے کو ڈال، دو ایک چکر دے، نکال لیا۔ بس سارے دن ان کا یہی شغل تھا۔ گھر میں برتن ہی نہیں تھے، کھانا کیسے پکتا اور کون پکاتا؟ خبر نہیں کہاں جاکر کھا پی آتے تھے؟

کبھی میں گیا، دیکھا کہ دروازے میں یہ بڑا قفل لٹک رہا ہے، سمجھ گیا کہ مولوی صاحب کہیں چڑنے چگنے تشریف لے گئے ہیں۔ میں نے کئی دفعہ پوچھا بھی کہ مولوی صاحب! آپ کے ہاں کچھ پکتا پکاتا نہیں، کہنے لگے: ”نہیں بھئی، میں نے تو مدتوں سے کھانا چھوڑ دیا ہے، صرف چائے پر گزران ہے“۔

تم مان لو، میں تو نہیں مانتا، میں نے خود اپنی آنکھوں سے ان کو کھاتے اور خوب کھاتے دیکھا ہے۔ ہاں، یہ ضرور کہ اپنے گھر کا پکا نہیں کھاتے تھے اور کھاتے تو کیوں کر کھاتے، پکانے کا انتظام کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ ماما رکھنی پڑتی۔ سامان منگوانا ہوتا۔ لکڑی کا خرچ، تیل کا خرچ، نون کا خرچ، غرض اتنے خرچ کون اپنے سر باندھے اور اپنی بھلی چنگی جان کو بیٹھے بٹھائے روگ لگائے۔ چائے بنالی، پی لی، اِدھر اُدھر گئے۔ پیٹ بھرلیا، گھر آئے، بان کی کھری چارپائی پر لوٹ ماری، چلو زندگی کا ایک دن کٹ گیا۔

ان کی بان کی چارپائی بھی نمائش میں رکھنے کے قابل تھی۔ ننگی پیٹھ اس پر اتنا لوٹے تھے کہ بان ف اور چمکدار ہو کر کالی اطلس ہوگیا تھا۔ ادوان خود کھینچتے تھے کہ ہاتھ مارو، تو طبلے کی آواز دے۔ خدا معلوم یہ چارپائی کس کے قبضے میں ہے؟ کسی کے پاس بھی ہو، سونے میں بڑا آرام دے گی۔

مولوی صاحب کو مٹھاس کا بڑا شوق تھا۔ خدا شکر خورے کو شکر دیتا ہے۔ ان کے بھی یار، دوست، شاگرد غرض کوئی نہ کوئی ان کو مٹھائی پہنچا ہی دیتا تھا۔ یہ کچھ کھاتے، کچھ رکھ چھوڑتے۔ مٹھائی کی ٹوکریوں میں جو کاغذ آتے، ان کو پونچھ پانچھ، صاف کر، جمع کرتے جاتے، انہی کاغذوں پر خط لکھتے، غزلیں لکھتے، غرض جو کچھ لکھنا پڑھنا ہوتا بس اِن ہی کاغذوں پر ہوتا، خدا معلوم ایسے جھر جھرے کاغذ پر یہ لکھتے کیوں کر تھے۔

مولوی صاحب دنیا میں کسی سے نہیں ڈرتے تھے۔ ہاں! ڈرتے تھے تو مولوی عبدالحق صاحب سے۔ میں نے کئی دفعہ کوشش کی کہ مولوی عبدالحق صاحب کے متعلق ان کی رائے معلوم کروں، مگر وہ کسی نہ کسی طرح ٹال گئے۔ تھوڑے دن اور جیتے تو پوچھ ہی لیتا۔ دوسروں کے متعلق مجھے ان کی رائے معلوم ہے۔ اگر ان ہی کے الفاظ میں لکھوں تو ابھی فوج داری ہوجائے۔

مولوی صاحب کو اصطلاحات وضع کرنے کا خاص ملکہ تھا۔ ایسے ایسے الفاظ دماغ سے اتارتے کہ باید وشاید۔ جہاں ثبوت طلب کیا اور انھوں نے شعر پڑھا اور کسی نہ کسی بڑے شاعر سے منسوب کردیا۔ اب خدا بہتر جانتا ہے کہ یہ خود اُن کا شعر ہوتا تھا یا واقعی اُس شاعر کا۔ بھلا ایک ایک لفظ کے لیے کون دیوان ڈھونڈنے بیٹھے اگر کوئی تلاش بھی کرتا اور وہ شعر دیوان میں نہ ملتا تو یہ کہہ دینا کیا مشکل تھا کہ یہ غیر مطبوعہ کلام ہے۔ انگریزی بالکل نہیں جانتے تھے، مگر انگریزی اصطلاحات پر پورے حاوی تھے۔ یہی نہیں بلکہ یہاں تک جانتے تھے کہ اس لفظ کے کیا ٹکڑے ہیں، ان ٹکڑوں کی اصل کیا ہے اور اس اصل کے کیا معنے ہیں۔ ان بلا کا حافظہ لے کر آئے تھے کہ ایک دفعہ کوئی لفظ سنا اور یاد ہوگیا۔ الفاظ کے ساتھ انھوں نے اس پر بھی بہت غور کیا تھا کہ انگریزی میں اصطلاحات بنانے میں کن اصولوں کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ انھیں اصولوں کو وہ اردو کی اصطلاحات وضع کرنے میں کام میں لاتے اور ہمیشہ کامیاب ہوتے۔ میری کیا، اس وقت سب کی یہ رائے ہے کہ اصطلاحات بنانے کے کام میں مولوی وحید الدین سلیم اپنا جواب نہیں رکھتے تھے اور اب ان کے بعد ان کا بدل ملنا دشوار تو کیا، ناممکن ہے۔ عربی اور فارسی میں اچھی دسترس تھی، مگر وہ اردو کے لیے بنے تھے اور اردو، ان کے لیے، خوب سمجھے تھے اور خوب سمجھاتے تھے۔ زبان کے جو نکات وہ اپنے شاگردوں کو بتا گئے

ہیں، اسی کا نتیجہ ہے کہ کالج کے لونڈے وہ مضمون لکھ جاتے ہیں، جو بڑے بڑے اہلِ قلم کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں آتے۔

مولوی صاحب کیا مرے، زبانِ اردو کا ایک ستون گر گیا اور ایسا ستون گرا کہ اس جیسا بننا تو کجا، اس حصے میں اڑ واڑ بھی لگانی مشکل ہے۔ ان کی جگہ بھرنے کے لیے دوسرے پروفیسر کی تلاش ہو رہی ہے، مگر عثمانیہ یونیورسٹی کے اربابِ حل و عقد لکھ رکھیں کہ چاہے اِس سرے سے اُس سرے تک ہندوستان چھان مارو، مولوی وحید الدین سلیم جیسا پروفیسر ملنا تو بڑی بات ہے، ان کا پاسنگ بھی مل جائے، تو غنیمت اور بہت غنیمت سمجھو۔

(مضامینِ فرحت)

مشق

۱۔ درج ذیل سوالات کے جوابات لکھیں۔

(الف) مولوی صاحب اور فرحت اللہ بیگ کی ملاقات کب اور کیسے ہوئی؟

(ب) مولوی صاحب کا حلیہ اپنے الفاظ میں بیان کریں؟

(ج) فرحت نے مولوی صاحب کے مزاج کے بارے میں کن خیالات کا اظہار کیا؟

(د) حیدر آباد کالج کے سالانہ جلسے میں کیا غلط فہمی پیدا ہوئی؟

(ہ) مولوی صاحب اپنی کفایت شعاری کے بارے میں کیا عذر پیش کیا کرتے تھے؟

(و) ''اور مولوی صاحب کی کسی نہ کسی سے بگڑ جاتی'' اس جملے کی وضاحت کریں؟

(ز) مولوی صاحب نے اصطلاحات وضع کرنے کے لیے کن اصولوں کا سہارا لیا؟

۲۔ درج ذیل جملوں کی وضاحت کریں۔

(الف) تیل ختم ہونے سے پہلے چراغ جھلملاتا، ٹمٹماتا، لو بیٹھنی شروع ہوتی اور آخر رفتہ رفتہ ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ اب چراغ کی جگہ زندگی بجلی کا لیمپ ہوگئی ہے۔ ادھر بٹن دبایا، ادھر گھپ اندھیرا۔

(ب) مگر میری زبان کب رُکتی ہے۔ میں نے کہا: ''مولوی صاحب! گھبراتے کیوں ہیں، بسم اللہ کیجیے، مر جائیے، مضمون میں لکھ دوں گا''

(ج) زبان اپنی تھی، کسی کا دینا نہیں آتا تھا، بے نقط سُنا کر دل ٹھنڈا کر لیتے تھے۔

(د) خشک سالی کے اندیشے سے ارزانی کے زمانے میں کھتے بھرنے کی فکر میں رہے۔

(ہ) جتنی اُن کی نگاہ وسیع ہوئی، اتنا ہی اُن کا دل تنگ ہوا۔

۳۔ خالی جگہ مناسب الفاظ سے پُر کریں:

(الف) صف سے آگے بڑھا اور تیر ______ کا شکار ہوا۔

(ب) ایک بڑے میاں بڑے بڑے ______ بھرتے میری طرف آرہے ہیں۔

(ج) اُن کی زُود ______ کی سب تعریف کرتے تھے۔

(د) اہل کمال ہمیشہ ______ حال رہے ہیں۔

(ہ) میں نے اُس ______ کی دلّی کا نقشہ کھینچا۔

(و) خُدا شکر خورے کو ______ دیتا ہے۔